تقریر

تقریر بابت اللہ تعالیٰ
وقت 5-7منٹ

محبتِ الٰہی

(تقریر نمبر1)

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ(البقرۃ:166)

یعنی مؤمن سب سے بڑھ کر اللہ سے محبّت کرنے والے ہوتے ہیں۔

خدا سے وہی لوگ کرتے ہیں پیار
جو سب کچھ ہی کرتے ہیں اس پر نثار
اسی فکر میں رہتے ہیں روز و شب
کہ راضی وہ دلدار ہوتا ہے کب

(درثمین)

معزّز سامعین! مجھے آج آپ حاضرین سے محبّتِ الٰہی پر گفتگو کرنی ہے۔ یہ مضمون اتنا لطیف اور گہرا ہے کہ شاید ایک روز میں بیان نہ ہو سکے اس لئے مَیں نے اس تقریر کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے اور کل بھی اسی موضوع پر گفتگو ہو گی۔ کائناتِ ہستی کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد ہی محبت پر اُستوار ہے۔ زمین اپنی کشش سے ہر شئے کو اپنے ساتھ وابستہ رکھتی ہے، دریا سمندر کی آغوش میں جا گرتے ہیں، پھول خوشبو بکھیرتے ہیں، پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹتے ہیں اور انسان جو اس پوری کائنات کا سب سے زیادہ باشعور اور حسّاس وجود ہے اپنی پیدائش سے لے کر آخری سانس تک کسی نہ کسی محبّت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ وہ محبّت چاہتا بھی ہے اور محبّت کرنا بھی چاہتا ہے۔ وہ کسی ایسے سہارے، کسی ایسی عظیم ہستی اور کسی ایسے ابدی تعلق کا متلاشی رہتا ہے جس کے ساتھ وابستگی اس کے وجود کی تمام پیاس کو بجھادے۔

مگر انسانی تجربہ گواہ ہے کہ دنیا کی ہر محبت محدود، عارضی اور فانی ہے۔ مال و دولت فنا پذیر ہیں، اقتدار عارضی ہے، شہرت وقت کے ساتھ ماند پڑ جاتی ہے اور انسانی تعلقات بھی بچھڑ جانے، بدل جانے یا ختم ہو جانے کے امکانات سے خالی نہیں۔ انسان کا دل چونکہ لامحدود خواہشات اور ابدی سکون کا طالب ہے، اس لیے کوئی محدود شئے اس کی روح کی مکمل تسکین نہیں کر سکتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی فطرت اسے ایک ایسی محبّت کی طرف رہنمائی کرتی ہے جو کامل بھی ہو، دائمی بھی، بے نیاز بھی اور ہر حسن و کمال کا سرچشمہ بھی۔ وہ محبّت صرف اور صرف محبّتِ الٰہی ہے۔

اسلام محبّتِ الٰہی کو محض ایک جذباتی واردات یا عارضی روحانی کیفیت قرار نہیں دیتا، بلکہ اسے ایمان کی روح، بندگی کی اساس اور انسانی زندگی کا حقیقی مقصود قرار دیتا ہے۔ قرآنِ کریم میں متعدّد مقامات پر خدا تعالیٰ اور بندے کے باہمی تعلق کو محبّت کے حسین اور روح پرور پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ(البقرۃ:166)

یعنی جو ایمان لائے وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبّت کرنے والے ہوتے ہیں۔

ایک اور مقام پر اہلِ ایمان کی سب سے ممتاز صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ(المائدۃ:55)

یعنی اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

یہ نہایت دل آویز حقیقت ہے کہ اسلام میں خدا اور بندے کا تعلق محض حاکم اور محکوم، خالق اور مخلوق یا رازق اور مرزوق کا تعلق نہیں بلکہ یہ تعلق محبّت کے ایک زندہ، باہمی اور روح پرور رشتے میں تبدیل ہو جاتا ہے، جہاں بندہ اپنے رب سے محبّت کرتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ سعادت حاصل کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس سے محبت فرمانے لگتا ہے۔ پھر اس محبّت کے حصول کا طریق بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا گیا:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ(آلِ عمران:32)

یعنی کہہ دے، اگر تم اللہ سے محبّت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبّت کرنے لگے گا۔

گویا محبتِ الٰہی کوئی مبہم تصوّر نہیں بلکہ ایک زندہ اور قابلِ حصول حقیقت ہے، جس کی شاہراہ اطاعتِ رسولِ صلی اللہ علیہ وسلم، اخلاصِ نیّت اور پاکیزگیِ کردار سے ہو کر گزرتی ہے۔ احادیثِ نبویہ میں بھی محبتِ الٰہی کو ایمان کی سب سے اعلیٰ نعمت قرار دیا گیا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تین باتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ پائی جائیں، وہ ایمان کی حلاوت پالیتا ہے، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں۔“

(صحیح البخاری)

ایک اور حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ مَیں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔“

(صحیح البخاری)

یہ وہ مقام ہے جہاں محبّت بندے کو محض عبادت گزار نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے محبوبِ الٰہی بنا دیتی ہے۔ پھر اس کی سماعت، اس کی بصارت، اس کی سوچ اور اس کی زندگی کا رخ ہی بدل جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عصرِ حاضر کا انسان سائنسی ترقی، مادی آسائشوں اور معلومات کی فراوانی کے باوجود شدید روحانی اضطراب کا شکار ہے۔ اس کے پاس ذرائع ہیں مگر سکون نہیں، تعلقات ہیں مگر اطمینان نہیں، سہولتیں ہیں مگر قلبی آسودگی نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی محبتوں کا مرکز ان چیزوں کو بنالیا ہے جو خود فنا کے تابع ہیں۔ چنانچہ اس کی روح مسلسل تشنگی اور بے قراری کا شکار رہتی ہے۔

انسان کی روح کا حقیقی وطن خدا کی محبت ہے۔ جب دل اپنے خالق کی محبت سے آباد ہو جاتا ہے تو زندگی کی ویرانیاں گلزار بن جاتی ہیں، عبادت میں لذت پیدا ہو جاتی ہے، مصائب میں صبر پیدا ہو جاتا ہے، تنہائی میں انس نصیب ہونے لگتا ہے اور انسان اپنے اندر ایک ایسی روشنی محسوس کرتا ہے جو دنیا کی کسی نعمت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ محبتِ الٰہی درحقیقت انسان کے روحانی سفر کی ابتدا بھی ہے اور اس کی معراج بھی، اس کی بندگی کا جوہر بھی ہے اور اس کی نجات کا راز بھی، اس کے اخلاق کی بنیاد بھی ہے اور اس کے اطمینانِ قلب کا حقیقی سرچشمہ بھی۔ یہی وہ محبت ہے جو انسان کو اس کی محدود خواہشات سے اٹھا کر ابدی حقیقتوں سے ہم کنار کرتی ہے اور اسے اس مقام تک پہنچا دیتی ہے جہاں اس کے دل کی ہر دھڑکن، اس کی ہر آرزو اور اس کی پوری زندگی پکار اٹھتی ہے:

”میرا محبوب، میری جنت، میرا سکون اور میری سب سے بڑی آرزو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔“

محبتِ الٰہی کی حقیقت اور انسانی فطرت

سامعین! محبت کوئی سیکھا ہوا ہنر نہیں، نہ ہی یہ محض جذبات کی ایک عارضی لہر ہے۔ یہ انسان کی فطرت میں ودیعت کردہ ایک ایسی بنیادی قوّت ہے جو اس کے پورے وجود کو حرکت، معنی اور سمت عطا کرتی ہے۔ انسان شعوری یا لاشعوری طور پر ہمیشہ کسی ایسی ہستی کی تلاش میں رہتا ہے جس سے وہ دل کی گہرائیوں سے وابستہ ہو سکے، جس پر مکمل اعتماد کر سکے اور جس کے قرب میں اسے اطمینانِ قلب میسّر آ سکے۔ گویا محبت انسانی روح کی ایک فطری ضرورت ہے اور جس طرح جسم غذا اور پانی کا محتاج ہے، اسی طرح روح بھی محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

تجربہ، تاریخ اور انسانی نفسیات اس حقیقت پر متفق ہیں کہ دنیا کی کوئی محبّت انسان کے دل کو مکمل اطمینان نہیں دے سکتی۔ لیکن جب محبت کا مرکز وہ ذات بن جائے جو ازلی بھی ہے، ابدی بھی، بے نیاز بھی اور تمام حسن و کمال کا سرچشمہ بھی، تو پھر دل کو وہ سکون نصیب ہوتا ہے جس کی اسے مدتوں سے تلاش ہوتی ہے۔

اسی حقیقت کی طرف قرآنِ کریم نہایت دل نشین انداز میں توجہ دلاتا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد:29)

یعنی سن لو! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

یہ محض ایک مذہبی نصیحت نہیں بلکہ انسانی نفسیات کا ایک ابدی قانون ہے۔ دل اپنے اصل منبع سے جُڑ کر ہی سکون پا سکتا ہے۔ روح اپنے خالق سے تعلق پیدا کر کے ہی زندہ ہوتی ہے اور محبت اپنی تکمیل صرف اسی وقت پاتی ہے جب اس کا مرکز خدا تعالیٰ کی ذات بن جائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام محبت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”محبت کوئی تصنّع اور تکلّف کا کام نہیں بلکہ انسانی قویٰ میں سے یہ بھی ایک قوت ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ دل کا ایک چیز کو پسند کر کے اس کی طرف کھنچے جانا۔“

(نور القرآن نمبر 2، روحانی خزائن جلد 9 صفحہ 430)

اس مختصر مگر نہایت عمیق ارشاد میں محبت کی پوری نفسیات سمٹ آئی ہے۔ محبت کوئی مصنوعی کیفیت نہیں جو انسان خود اپنے اوپر طاری کر لے، بلکہ یہ دل کا ایک فطری میلان ہے۔ انسان جب کسی حسن، کسی کمال اور کسی احسان کو پہچانتا ہے تو طبعی طور پر اس کی طرف کھنچنے لگتا ہے اور اگر حسن کامل ہو، کمال لامحدود ہو اور احسان بے شمار ہوں تو پھر محبت بھی کامل اور بے مثال ہو جاتی ہے۔

خدا تعالیٰ تمام حسنوں کا سرچشمہ، تمام کمالات کا منبع اور تمام نعمتوں کا حقیقی عطا کنندہ ہے۔ سورج کی روشنی، بارش کا نزول، زمین کی زرخیزی، ماں کی محبت، صحت کی نعمت، عقل کی روشنی، ہدایت کی دولت اور زندگی کا ہر لمحہ اسی کے احسانات کا مظہر ہے۔ انسان اگر انصاف اور بصیرت کی نگاہ سے دیکھے تو وہ اپنے آپ کو ہر لمحہ اپنے ربّ کے احسانات میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایسے محسنِ حقیقی سے محبت نہ کرے؟۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام مزید فرماتے ہیں:

”جو شخص خدا سے محبت کرتا ہے وہ ظلّی طور پر بقدر اپنی استعداد کے اس نور کو حاصل کر لیتا ہے جو خدا تعالیٰ کی ذات میں ہے۔“

(نور القرآن نمبر 2، روحانی خزائن جلد 9 صفحہ 430)

یہ محبتِ الٰہی کا نہایت لطیف اور حیرت انگیز فلسفہ ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے، آہستہ آہستہ اس کے رنگ میں رنگین ہونے لگتا ہے۔ محبت صرف جذبہ نہیں، ایک تبدیلی آفرین قوت ہے۔ دنیا کی محبت انسان کو دنیا پرست بنا دیتی ہے، اقتدار کی محبت اسے متکبر بنا دیتی ہے اور نفس کی محبت اسے خواہشات کا غلام بنا دیتی ہے لیکن خدا تعالیٰ کی محبت انسان کے اندر نور، رحم، انکسار، عفو، صبر، ایثار اور تقویٰ پیدا کر دیتی ہے۔ تاریخ انبیاء اس حقیقت کی روشن گواہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے ایک لغزش سرزد ہوئی تو جنت کی نعمتوں سے زیادہ انہیں اپنے ربّ کے قرب کی جدائی نے بے قرار کر دیا۔ ان کی زبان پر کوئی شکوہ نہ تھا، کوئی عذر نہ تھا، بلکہ دل کی گہرائیوں سے صرف ایک ہی صدا بلند ہوئی:

رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (الاعراف:24)

یہ محض توبہ کے الفاظ نہ تھے، بلکہ ایک عاشق کی اپنے محبوب سے دوبارہ قریب ہو جانے کی تڑپ تھی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اصل منزل نہ دنیا ہے، نہ اس کی ظاہری نعمتیں بلکہ اس کا حقیقی وطن اپنے ربّ کا قرب اور اس کی محبت ہے۔

درحقیقت محبتِ الٰہی انسان کو اپنی ذات کی قید سے آزاد کر دیتی ہے۔ وہ جو پہلے اپنے مفادات، خواہشات اور نفسانی تقاضوں کے گرد گھومتا تھا، اب ایک بلند روحانی اُفق میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی سوچ بدل جاتی ہے، اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں، اس کے تعلقات بدل جاتے ہیں اور اس کی زندگی کا مرکز تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نیکی اس لیے نہیں کرتا کہ لوگ اس کی تعریف کریں اور بُرائی سے اس لیے نہیں بچتا کہ لوگ اسے بُرا کہیں، بلکہ اس کی زندگی کا واحد محرّک اپنے محبوبِ حقیقی کی رضا بن جاتی ہے۔ یہی محبتِ الٰہی کی ابتدا ہے اور یہی وہ مبارک لمحہ ہے جب انسان کا حقیقی روحانی سفر شروع ہوتا ہے، ایک ایسا سفر جو اسے اپنی ذات سے اٹھا کر خدا کی معرفت، اس کی قربت اور بالآخر اس کی رضا کے آستانے تک لے جاتا ہے۔

محبتِ الٰہی کا سرچشمہ: احسانِ خداوندی کا شعور اور عشقِ ذاتی کا آغاز

محبتِ الٰہی کا چراغ اچانک روشن نہیں ہو جاتا۔ یہ معرفت کے چراغ دان میں احسانِ الٰہی کے تیل سے جلنے والی وہ مقدّس شمع ہے جو جوں جوں انسان پروردگار کے انعامات، اس کی ربُوبیّت، اس کی رحمت اور اس کی مسلسل نگہبانی پر غور کرتا ہے، توں توں اس کے دل میں محبت کی لو تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ انسان جب اپنے وجود کے ہر گوشے میں خدا تعالیٰ کے فضل کے آثار دیکھتا ہے، جب وہ اپنی سانسوں سے لے کر اپنے شعور تک ہر چیز کو ایک عطیہ ربّانی محسوس کرتا ہے، تو پھر اس کے دل میں اپنے محسنِ حقیقی کے لیے ایک ایسی والہانہ کشش پیدا ہوتی ہے جو محض عقلی اعتراف نہیں رہتی بلکہ عشق میں ڈھل جاتی ہے۔

اسی حقیقت کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہایت لطیف انداز میں بیان فرمایا:

”پس اس صورت میں وہ صرف احسانات کے تصور سے اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ اس کی ذاتی محبت اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے جیسا کہ بچہ کو ایک ذاتی محبت اپنی ماں سے ہوتی ہے۔“

(نور القرآن نمبر 2، روحانی خزائن جلد 9 صفحہ 439)

یہ تشبیہ اپنے اندر محبت کی پوری نفسیات سموئے ہوئے ہے۔ ایک شیر خوار بچہ اپنی ماں کے فلسفے کو نہیں جانتا، وہ اس کے احسانات کی علمی فہرست مرتب نہیں کرتا، مگر وہ اپنے وجود کے ہر لمحے میں خود کو ماں کی آغوشِ شفقت میں محفوظ پاتا ہے، اسی لیے اس کی محبت فطری، بے غرض اور خالص ہوتی ہے۔ بعینہٖ ایک مؤمن جب زندگی کے ہر موڑ پر خدا تعالیٰ کی رحمتوں کو محسوس کرتا ہے تو اس کے دل میں بھی ایک ایسی ذاتی محبت پیدا ہو جاتی ہے جو نہ کسی خوف کی محتاج رہتی ہے اور نہ کسی طمع کی۔ قرآنِ کریم بار بار انسان کو خدا تعالیٰ کے احسانات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے: وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (النحل: 54) کہ تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے، وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ محبت کی بنیاد شعورِ احسان پر قائم ہوتی ہے۔ انسان جس قدر یہ سمجھتا جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ خدا کے فضل کا مقروض ہے، اسی قدر اس کا دل اپنے رب کی محبت میں پگھلتا چلا جاتا ہے۔

ایک روح پرور مثال: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی محبت

تاریخِ انسانیت میں محبتِ الٰہی کا شاید ہی کوئی منظر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان سے زیادہ درخشاں ہو۔ بڑھاپے میں عطا ہونے والا اکلوتا فرزند، جس کی ولادت کے لیے برسوں دعائیں کی گئی تھیں، جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو آسمان سے حکم آتا ہے:

اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُكَ (الصافات: 103)

یعنی مَیں خواب میں دیکھتا ہوں کہ مَیں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔

یہ صرف ایک حکم نہ تھا بلکہ محبت کا سب سے بڑا امتحان تھا۔ ایک طرف پدری محبت تھی، دوسری طرف محبتِ الٰہی۔ مگر عشقِ الٰہی کی میزان میں دنیا کی ہر محبت ہلکی ثابت ہوئی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی اسی محبت کا رنگ اختیار کیا اور عرض کیا:

یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ (الصافات: 103)

کہ اے میرے والد! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اسے پورا کیجیے، ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

یہ منظر دراصل محبتِ الٰہی کی معراج ہے۔ جب دل خدا کی محبت سے لبریز ہو جائے تو پھر انسان اپنی عزیز ترین متاع بھی اس کے حضور قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ یعنی ”اللہ کا دوست“ قرار دیا۔ یہ واقعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ محبتِ الٰہی اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچتی جب تک انسان کی تمام محبتیں خدا کی محبت کے تابع نہ ہو جائیں۔ جو دل خدا کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے، خدا تعالیٰ بھی اسے اپنے قرب کے اعلیٰ مقامات عطا فرماتا ہے۔ اسی لیے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے محبت کے مدارج بیان کرتے ہوئے واضح فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سفر بتدریج طے ہوتا ہے۔ پہلے انسان خدا کو اپنا خالق اور مالک سمجھتا ہے، پھر اس کے احسانات کو دیکھتا ہے اور آخرکار ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کا دل خدا تعالیٰ کی ذاتی محبت میں محو ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عبادت محض فرض نہیں رہتی بلکہ لذت بن جاتی ہے، دعا محض الفاظ نہیں رہتی بلکہ راز و نیاز بن جاتی ہے اور اطاعت محض ذمہ داری نہیں رہتی بلکہ محبوب کی رضا کا دل آویز اظہار بن جاتی ہے۔

محبتِ الٰہی کے مدارج: عدل سے احسان اور احسان سے عشقِ ذاتی تک

پیارے بھائیو! محبتِ الٰہی ایک لمحاتی جذبہ نہیں بلکہ روح کی تدریجی تربیت اور قلب کے مسلسل تزکیّے کا نام ہے۔ جس طرح ایک بیج آہستہ آہستہ نشو و نما پا کر تناور درخت بنتا ہے، اسی طرح خدا تعالیٰ سے تعلق بھی مختلف روحانی مراحل سے گزرتا ہوا اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ ابتدا میں انسان خدا کو پہچانتا ہے، پھر اس کے احسانات کا شعور حاصل کرتا ہے اور بالآخر اس مقام میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اس کا پورا وجود اپنے محبوبِ حقیقی کی محبت میں ڈوب جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآنِ کریم کی روشنی میں اس روحانی سفر کے تین بنیادی مدارج بیان فرمائے ہیں: عدل، احسان اور ایتائے ذی القربیٰ۔ یہی تین مدارج دراصل محبتِ الٰہی کے ارتقائی سفر کی منزلیں ہیں۔

پہلا درجہ: عدل

عدل کا مقام ایمان کی ابتدائی منزل ہے۔ اس مرحلے میں انسان اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کا خالق، مالک، رازق اور پروردگار ہے، اس لیے اس کی عبادت، اطاعت اور شکر گزاری بندے پر واجب ہے۔

یہ تعلق ابھی عقلی ادراک اور فرض شناسی کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ انسان نیکی اس لیے کرتا ہے کہ یہ اس کے رب کا حکم ہے، برائی سے اس لیے بچتا ہے کہ یہ اس کے رب کی ناپسندیدہ چیز ہے۔ گویا یہاں اطاعت موجود ہے، مگر محبت ابھی اپنے ابتدائی مدارج میں ہے۔

قرآنِ کریم اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ (البقرۃ:22)

کہ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

یہاں عبادت کی بنیاد تخلیق اور ربوبیّت کے اعتراف پر رکھی گئی ہے۔ گویا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنے ربّ کو پہچانے اور اس کے حقوق کو تسلیم کرے۔

دوسرا درجہ: احسان

جب بندہ معرفت میں ترقی کرتا ہے تو اس کی نگاہ ظاہری اسباب سے آگے بڑھنے لگتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کی زندگی کی ہر نعمت، ہر آسانی، ہر کامیابی اور ہر حفاظت کے پیچھے ایک ہی ہاتھ کارفرما ہے۔ اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے رب کی رحمتوں میں گھرا ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی جامع تعریف میں بیان فرمایا:

أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ

(صحیح مسلم)

کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”وہ ایسے محسن کی عبادت کرنے کے وقت اس کو غائب نہیں سمجھتا بلکہ یقیناً اس کو حاضر خیال کر کے اس کی عبادت کرتا ہے اور اس عبادت کا نام قرآن شریف میں احسان ہے۔“

(نور القرآن نمبر2، روحانی خزائن جلد9 صفحہ 438)

ایک ایمان افروز مثال: سیدنا بلال حبشیؓ

احسان اور محبتِ الٰہی کا ایک بے مثال نمونہ سیدنا بلال حبشیؓ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ تپتے ہوئے صحرا کی جلتی ریت، جسم پر رکھے گئے بھاری پتھر، مسلسل کوڑے اور ناقابلِ برداشت اذیتیں یہ سب کچھ ان کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکا۔ ان کی زبان پر صرف ایک ہی صدا جاری تھی: ”أَحَدٌ... أَحَدٌ“ کہ وہ ایک ہے... وہ ایک ہے۔

یہ صرف عقیدے کا اعلان نہ تھا بلکہ محبت کا نعرہ تھا۔ یہ اس دل کی آواز تھی جس نے اپنے ربّ کو پا لیا تھا۔ جسم زخمی تھا مگر روح اپنے محبوب کے قرب میں سرشار تھی۔ دنیا کی تمام تکلیفیں اس محبت کے سامنے بے وزن ہو چکی تھیں۔ یہی محبت انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں دنیا کا خوف، ظلم کی شدّت اور آزمائش کی سختی بھی اس کے قدموں میں لغزش پیدا نہیں کر سکتی۔

تیسرا درجہ: ایتائے ذی القربیٰ

محبتِ الٰہی کی معراج ایتائے ذی القربیٰ کا مقام ہے۔ یہاں بندے اور خدا کے درمیان تعلق صرف فرض، جزا، خوف یا احسان مندی کی بنیاد پر قائم نہیں رہتا بلکہ ایک گہری ذاتی محبت میں ڈھل جاتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

"پس اس مرتبہ پر وہ عبادت کے وقت صرف خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہی نہیں بلکہ دیکھ کر سچے عشاق کی طرح لذّت بھی اٹھاتا ہے اور تمام اغراض نفسانی معدوم ہو کر ذاتی محبت اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔"

(نور القرآن نمبر 2، روحانی خزائن جلد 9 صفحہ 439)

یہ محبت کی وہ منزل ہے جہاں عبادت میں تکلّف باقی نہیں رہتا، قربانی بوجھ محسوس نہیں ہوتی اور اطاعت مشقّت نہیں لگتی۔ انسان جنت کی طلب یا جہنم کے خوف سے نہیں بلکہ صرف اپنے محبوب کی رضا کے لیے جیتا ہے۔

پھر اس کے دل کی ہر دھڑکن گویا ایک خاموش دعا بن جاتی ہے اور اس کی زندگی کا ہر لمحہ اپنے ربّ کی خوشنودی کی جستجو میں بسر ہونے لگتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اسی کیفیت کو مزید واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ وہ مرتبہ ہے جس میں تمام اغراض نفسانی جل جاتے ہیں اور دل ایسا محبت سے بھر جاتا ہے جیسا کہ ایک شیشہ عطر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔"

(نور القرآن نمبر 2، روحانی خزائن جلد 9 صفحہ 440)

کتنی دل آویز تشبیہ ہے! جس طرح عطر سے بھری شیشی کے قریب آنے والا ہر شخص اس کی خوشبو محسوس کرتا ہے، اسی طرح محبتِ الٰہی سے لبریز دل سے بھی رحم، انکسار، اخلاص، شفقت، عفو، تقویٰ اور نیکی کی خوشبو پھوٹتی ہے۔ ایسا انسان خاموش رہ کر بھی دعوتِ حق بن جاتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی خود اس محبت کی گواہی دینے لگتی ہے جو اس کے دل کے اندر چراغ کی مانند روشن ہے اور جب انسان اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کی سب سے بڑی خواہش یہ نہیں رہتی کہ وہ دنیا میں کیا حاصل کرے، بلکہ یہ بن جاتی ہے کہ وہ اپنے محبوبِ حقیقی کو کبھی ناراض نہ کرے۔ یہی احساس محبتِ الٰہی کی اگلی اور نہایت اہم علامتوں کو جنم دیتا ہے، جن میں خدا کی ناراضی کا خوف، استغفار کی کثرت اور گناہ سے شدید نفرت شامل ہیں۔

محبتِ الٰہی کی علامات: خوفِ فراق، استغفار اور گناہ سے نفرت

ہر محبت اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے۔ پھول اپنی خوشبو سے، آگ اپنی حرارت سے اور چشمہ اپنے جاری پانی سے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح محبتِ الٰہی بھی کوئی پوشیدہ یا مبہم کیفیت نہیں۔ جب یہ دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے تو انسان کے افکار، اعمال، ترجیحات اور روحانی کیفیات سب بدلنے لگتے ہیں۔ اس کے دل میں نئی حساسیت پیدا ہوتی ہے، اس کی روح میں نئی لطافت پیدا ہوتی ہے اور اس کی زندگی کا محور اپنے محبوبِ حقیقی کی رضا بن جاتا ہے۔

محبتِ الٰہی کی سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ انسان اپنے محبوب سے جدائی کے تصوّر سے بھی لرز اٹھے۔ وہ اس بات سے خوف زدہ رہتا ہے کہ کہیں اس کی کوئی لغزش، کوئی غفلت یا کوئی گناہ اسے اپنے ربّ کے قرب سے محروم نہ کر دے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

"سچی اور ذاتی اور کامل محبت کے ساتھ عذاب جمع ہو ہی نہیں سکتا اور سچی محبت کے علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی فطرت میں یہ بات منقوش ہوتی ہے کہ اپنے محبوب کے قطع تعلق کا اُس کو نہایت خوف ہوتا ہے۔"

(چشمۂ مسیحی، روحانی خزائن، جلد 20، صفحہ 378)

یہ خوف سزا کا خوف نہیں بلکہ فراق کا خوف ہے۔ یہ اس عاشق کا اضطراب ہے جو اپنے محبوب کی ناراضی کا تصوّر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ دنیا میں بھی جس شخص سے سچی محبت ہو، اس کی ناراضی انسان کے لیے بے چینی اور اضطراب کا باعث بن جاتی ہے۔ پھر وہ خدا، جو تمام محبتوں کا سرچشمہ اور تمام حُسنوں کا منبع ہے، اس کی ناراضی ایک عاشقِ صادق کے لیے کس قدر جانکاہ ہونی چاہیے۔ اسی لیے سچا مؤمن گناہ کو صرف ایک اخلاقی یا قانونی خطا نہیں سمجھتا بلکہ اسے اپنے محبوب کے ساتھ تعلق میں دراڑ پیدا کرنے والی چیز تصوّر کرتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وہ ایک ادنیٰ غفلت کو اور ادنیٰ التفات کو جو خدا کو چھوڑ کر غیر کی طرف کی جائے ایک کبیرہ گناہ خیال کرتا ہے۔" (چشمۂ مسیحی، روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 378)

یہ محبت کانہایت بلند مقام ہے۔ یہاں انسان صرف ظاہری گناہوں سے نہیں بچتا بلکہ اپنے دل کی دنیا کی بھی نگرانی کرتا ہے۔ وہ اپنی نیتوں، خواہشوں اور توجہات کا محاسبہ کرتا رہتا ہے کہ کہیں کوئی دنیا پرستی، خود نمائی یا نفسانی میلان اسے اپنے محبوب سے دُور نہ لے جائے۔ قرآنِ کریم بھی اسی کیفیت کو یوں بیان فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (المؤمنون: 61)

کہ وہ لوگ جو نیک اعمال بجالاتے ہیں مگر ان کے دل اس خوف سے لرزتے رہتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی محبت عطا فرمائے۔ آمین

(باقی کل۔ اِن شاء اللہ)

(یہ تقریر مکرم نعیم اللہ باجوہ۔ میلبورن آسٹریلیا کے ایک مضمون سے تیار کی گئی ہے۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ)

۞۞۞۞